مایوسی اور احساس زیاں

کسی قوم کا حقیقی لیڈر وہ ہوتا ہے جو قوم میں احساس زیاں تو پیدا کرے لیکن کبھی مایوسی نہ پیدا ہونے دے ۔ یہی ایک فکری لیڈر کی سب سے بڑ ی خوبی ہوتی ہے ۔ ہماری جدید تاریخ میں اس کی سب سے بڑ ی مثال علامہ اقبال ہیں ۔ اقبال نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے قوم کے مسائل کی نشاندہی کی۔قوم کو جھنجھوڑ نے کے لیے دل ہلادینے والے مرثیہ پڑ ھے ، سخت قسم کی تنقید کی، خرابیوں کی نشان دہی کی۔ مگر ساتھ ساتھ لوگوں کی امید کو زندہ رکھا۔ مسائل کی نشان دہی کے ساتھ ایک عملی حل دیا۔ یہی ایک سچے مفکر کی نشانی ہوتی ہے ۔
اس کے برعکس آج ہمارے ہاں جس قسم کی فکری لیڈر شپ ہے وہ قوم میں بدترین مایوسی پیدا کر رہی ہے ۔ ان میں سے بیشتر لوگ وہ ہیں جنھیں اللہ نے لکھنے یا بولنے کی کچھ صلاحیت اور اس کے اظہار کے لیے کوئی پلیٹ فارم دے یا ہے ۔ مگر بدقسمتی سے یہ لکھنے اور بولنے والے یہ شعور نہیں رکھتے کہ زندہ مفکر کبھی قوم میں مایوسی پید انہیں کرتے ۔ وہ قوم میں احساس زیاں پیدا کرتے ہیں ۔ احساس زیاں کے بغیر لوگ اصلاح کے لیے نہیں اٹھتے ۔اس لیے اسے ضرور پیدا کرنا چاہیے ۔ لیکن ایک مفکر کو کبھی مایوسی نہیں پیدا کرنی چاہیے ۔ مایوسی قوت عمل چھین لیتی ہے ۔ اس سے بڑ ھ کر یہ لوگوں کو برا اور بد عمل بنادیتی ہے ۔ یوں یہ مرثیہ گوئی کسی برائی کو ختم نہیں کرتی بلکہ ایک اور برے شخص کا معاشرے میں اضافہ کر دیتی ہے ۔
ہماری فکری قیادت پر یہ فرض ہے کہ وہ قلم اٹھانے اور زبان کھولنے سے قبل یہ فرق کرنا سیکھے کہ احساس زیاں پیدا کرنا اور مایوسی پیدا کرنا دو الگ الگ چیزیں ہوتی ہیں ۔جو لوگ اس کا شعور نہیں رکھتے انھیں اقبال کی زندگی اور کام کو غور سے سمجھنا چاہیے ۔ اقبال اپنی ذات میں سب سے بڑ ی رہنمائی ہیں کہ مایوسی اور احساس زیاں میں کیا فرق ہوتا ہے ۔

چند برس

یہ ابتدائی دور کا مکہ ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں ۔ مگر کفار مان کر نہیں دیتے اور اپنے کفر پر اڑ ے ہوئے ہیں ۔ وہ نبوت کے معجزات طلب کرتے ہیں ۔عذاب کی دھمکی پر کہتے ہیں کہ سچے ہو تو ابھی عذاب لاؤ۔ ایسے میں سورہ شعراء نازل ہوتی ہے ۔اس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے پہلے کتنی ہی اقوام کو ہلاک کیا جا چکا ہے ۔
سورت کے اختتام پر ایک عجیب بات کہی گئی۔ فرمایا گیا کہ اگر ہم ان کفار کو چند برس اور سامان دنیا میں عیش کرنے کی مہلت دے دیں ۔پھر جس عذا ب کا وعدہ ہے وہ ان پر آجائے تو یہ سروسامان ان کے کس کام آئے گا۔
ان آیات کے نزول کے چند برس بعد جنگ بدر ہوئی۔تما م سرداران مکہ اور سرکش کفار جنگ بدر میں جہنم رسید ہوگئے ۔اللہ کے عذاب کا وعدہ پورا ہو گیا۔جب پکڑ آئی تو ان کی طاقت اور سروسامانی، لاؤ لشکر، مال و دولت، اولاد اور خدام کچھ کام نہ آئے ۔چند برس میں سب ختم۔
یہ ’’چند برس‘‘ کی سروسامانی، عیش و عشرت، ڈھیل اورمہلت ہر انسان کو دھوکے میں ڈال

دیتی ہے ۔ انسان سمجھتا ہے کہ اسے کوئی پکڑ نے والا نہیں ۔ وہ کسی بھی جان، مال ، عزت و آبرو پر حملہ کرے ، کچھ نہیں ہو گا۔وہ الزام و بہتان، جھوٹ ، بددیانتی، کرپشن سے دنیا میں عزت، دولت اور طاقت کو حاصل کر لے ۔کچھ فرق نہیں پڑ ے گا۔اس کا ہاتھ کوئی نہیں روکے گا۔

مگرنہیں ۔ یہ دنیا ''چند برس'' کا ایک دھوکہ ہے اور کچھ نہیں ۔آج کے ہر کرپٹ، ہر ظالم، ہر دولت مند، ہر طاقتور اورہر مجرم کو مرجانا ہے ۔2015 میں نہ سہی2035میں سہی۔ سو ایسے لوگوں سے پوچھنا چاہیے ۔اُس وقت وہ کیا کریں گے جب چند برس بعد ان کی مہلت عمل سلب ہو گی۔ جب چند برس بعد ان کا احتساب شروع ہو گا ۔ ان پر عذاب شروع ہو گا۔

آگ

سن اسی کی دہائی سے مسلمانوں میں عمومی طور پر دین کا رجحان بہت بڑ ھ گیا ہے جو یقینا بڑ ی اچھی بات ہے ۔تاہم اس رجحان کے باوجود عمومی طور پر وہ مسلمان نظر نہیں آتے جس کی جھلک سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آتی ہے یا پھر جس کا ذکر قرآن مجید کے بیانات میں اللہ کے مطلوب انسان کے طور پر ملتا ہے ۔اس مطلوب انسان کی تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب ''قرآن کا مطلوب انسان'' دیکھی جا سکتی ہے ۔

بدقسمتی سے اس کے برعکس جس قسم کے مسلمان نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر فرقہ واریت اور تعصبات کے اسیر ہوتے ہیں ۔ایسے ''دیندار'' مرو و عورت سے آپ گفتگو کر لیجیے ، تھوڑ ی ہی دیر میں معلوم ہوجائے گا کہ صحیح دین سے اس کی مراد اس کا خاص فرقہ ہے ۔ وہ اپنے فرقے کے علاوہ ہر ایک کو گمراہ سمجھتا ہے ۔اس کا فرقہ اور نظریات عین حق اور باقی سب باطل ہیں ۔

یہ دینداری کسی تحقیق اور جستجو پر مبنی نہیں بلکہ سنی سنائی باتوں پر قائم ہوتی ہے ۔ ایسا شخص جس گروہ میں پہلی دفعہ بیٹھ گیا، جس عالم سے پہلے متاثر ہو گیا یا جہاں سے اسے اپنے جذبات و خواہشات کے مطابق دین مل گیا، وہ اس کے لیے حق بن جاتا ہے ۔اب جو شامت کا مارا اس کے خاص نظریات اور تعصبات سے ، چاہے کسی دلیل کی بنیاد پر، اختلاف کر دے وہ اس کا نشانہ بن جاتا ہے ۔ اس کے خلاف مہم چلائی جاتی ہے ۔ اسے بدنام کیا جاتا ہے ۔

ایسا کرنے والے متعصب لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی طرز عمل کفارمکہ نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اختیار کیا تھا۔یہی وہ رویہ ہے جس کی تنقید سے قرآن کریم بھرا پڑ ا ہے ۔ یہی وہ رویہ ہے جس پر روز قیامت جہنم کی آگ کی وعید کی گئی ہے اوریہی رویہ ہے جو آج ہمارے معاشرے کو فرقہ واریت اور دہشت گردی کی آگ میں جلا رہا ہے ۔

عام انا خاص انا

''اللہ کی راہ میں سب سے مشکل کام کیا ہے ؟''، عارف کی نشست ختم ہورہی تھی۔ بیشتر وقت لوگ سوالات کرتے رہے اور عارف جواب دیتے رہے ۔ آخر میں انھوں نے لوگوں سے یہ سوال پوچھ لیا۔ جوابات آئے اور بیشتر لوگوں کی رائے تھی کہ اپنی جان دے دینا اس راہ کا سب سے مشکل اور بڑ ا کام ہے ۔عارف خاموش رہے اور اس رائے پر لوگوں کا اجماع ہوتے دیکھتے رہے ۔جب سب بول چکے توعارف نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دینا شروع کیا۔
''بے شک جان دینا بہت بڑ ی بات ہے ۔اللہ کے لیے جان دینے کے تو کیا ہی کہنے اور اس کا کیا ہی بڑ ا اجر ہے ۔ مگر غور کیجیے کہ انسانی تاریخ میں جو ہزاروں جنگیں ہوئیں ہیں ، ان میں کروڑ وں لوگوں نے پورے شعور سے اپنے ملک، قوم، بادشاہ اور متعدد دیگر بڑ ے مقاصد کی خاطر جان دی ہے اور آج بھی دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ''
عارف اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے ۔لوگوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی رائے لوگوں سے مختلف ہے ۔ وہ اب اس رائے کو جاننے کے منتظر تھے ۔ عارف ان کا انتظار ختم کرتے ہوئے بولے :
''انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ۔ ایک اندرونی شخصیت اور دوسرا ظاہری جسم۔ جان دینا ظاہری جسم کی قربانی ہے ۔ بے شک یہ بڑ ی بات ہے ، مگر جان دینے پر ابھارنے کے لیے ایک قادر الکلام مقرر کی زور دار تقریر، جذبات میں ہلچل پیدا کر دینے والی فیصلہ کن گھڑ ی اور محبت و نفرت کے جذبے کی شدت کا کوئی لمحہ کافی ہوتا ہے ۔
مگر اپنی اندرونی شخصیت کو قربان کرنا جسے عام الفاظ میں انا کو قربان کرنا کہتے ہیں ، اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے ۔انسان کسی بنا پر کسی خاص لمحے میں یہ کر بھی لے تو اگلے لمحے میں انا زندہ ہوجاتی ہے ۔ کسی جذبے کی وجہ سے کسی خاص شخص کے سامنے یہ کربھی کر لے تو دوسرے شخص کے سامنے انا تن کر کھڑ ی ہوجاتی ہے ۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے انا کو ختم کر دیا ہے ، مگر وہ پوری طرح موجود ہوتی ہے ۔''
''تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ انا ختم ہوئی یا نہیں ۔''
'' بتاتا ہوں ، مگر پہلے یہ سمجھ لیں کہ انا دو قسم کی ہوتی ہے ۔ ایک عام اور دوسری خاص ۔عام انا اپنا اظہار بہت کھل کر کرتی ہے اس لیے اس کو جاننا بڑ ا آسان ہے ۔ یہ وہی چیز ہے جسے تکبر کہتے ہیں ۔ یعنی خود کو کسی بھی پہلو سے بڑ ا سمجھنا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنا۔کوئی بھی اس کی نشاندہی کرسکتا ہے اور ہم مخلص ہوں تو فوراً اپنی اصلاح کرسکتے ہیں ۔ چنانچہ جب ہم خود کو بڑ ا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں تو اس عام انا سے نجات پالیتے ہیں ۔جبکہ خاص انا کو لوگ سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں ۔خود کو حقیر و فقیر کہنے والوں کی انا بھی آسمان تک بلند ہوتی ہے اور ان کو خبربھی نہیں ہوپاتی۔
''اس انا کو کیسے پہچانا جائے ؟''، ایک اور شخص نے سوال کیا۔
'' اس کی پہچان آسان نہیں ۔ مگر اس کی کچھ موٹی موٹی نشانیاں بتادیتا ہوں ۔ پہلی یہ کہ آپ کسی اور انسان کی خوبیوں کے اعتراف کی عادت نہ رکھتے ہوں ۔دوسری یہ کہ جب آپ پر تنقید کی جائے تو آپ ناقد کی بات سمجھنے سے پہلے ہی اس کی بات کا جواب سوچنے لگیں ۔ اور تیسری یہ کہ جب کوئی شخص آپ کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرے تو آپ کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح اس میں بھی فوراً کوئی خرابی اور خامی تلاش کرنا شروع کر دیں ۔

ان میں سے ہر رویہ یہ بتاتا ہے کہ آپ انا کے مریض ہیں ، لیکن چونکہ تکبر ایک سماجی برائی سمجھا جاتا ہے اس لیے آپ اسے چھپا کر رکھتے ہیں ۔ لیکن جس نے اپنے مرض کو سمجھ لیا وہ یقینا اس سے نجات پالے گا۔‘‘
عارف خاموش گئے اورآسمان معرفت کی ایک اور بارش دلوں کی زمینوں کو سیراب کرگئی۔

ایک مظلوم آیت

قرآن مجید میں شریعت کے کم و بیش تمام احکام قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں یعنی سورہ بقرہ سے سورہ مائدہ میں دیے گئے ہیں ۔سورہ مائدہ کے اختتام پر ایک آیت ہے جو پوری شریعت اور دین کے بارے میں ایک اصولی ہدایت دیتی ہے ۔ مگر بدقسمتی سے آج کے دور میں اس آیت کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جس کی وہ مستحق ہے ۔ سورہ مائدہ کی 105نمبر اس آیت کا ترجمہ یہ ہے ۔
اے ایمان والو!تم اپنی فکر رکھو، اگر تم ہدایت پر ہو تو کسی دوسرے کی گمراہی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ ے گی۔تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے ، پھروہ تم کو بتادے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔
یہ آیت اہل ایمان کو ایک انتہائی مثبت انداز فکر دیتی ہے ۔ یہ انسان کی توجہ خارج کی اس دنیاسے ہٹادیتی ہے جس میں بہت زیادہ کوشش کر کے بہت تھوڑ ی تبدیلی لانا بھی آسان نہیں ۔ اس کے برعکس یہ انسانوں کی فکر وعمل کا رخ اس کے اپنے وجود کی طرف موڑ دیتی ہے ۔ اپنی اصلاح اور بہتری کا یہ راستہ ایک ایسی دنیا کا راستہ ہے جہاں انسان کی کامیابی یقینی ہے ۔ جہاں وہ مکمل انقلاب برپا کرسکتا ہے ۔
مگر بدقسمتی سے دور جدید میں مختلف تاویلات کر کے اس آیت کو غیر اہم بنادیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس کے بعد لوگوں کی ساری توجہ دوسروں کی طرف رہتی ہے ۔ دوسرے کیا کر رہے ہیں ۔ ان کا علم و عمل کیسا ہے ۔ دنیا میں کیا ہورہا ہے ۔ دنیا میں کیسے انقلاب لایا جائے ۔ دوسرے پر دین کیسے ٹھونسا جائے ایسے لوگوں کامسئلہ بن جاتا ہے ۔
انسانی دماغ ظاہر ہے کہ ایک وقت میں دو سمت نہیں چل سکتا۔ جس دل میں دوسروں کی اصلاح کا سودا سماجائے ، بہت مشکل ہے کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف کوئی توجہ دے ۔ جو نظر ہمیشہ دوسروں کی طرف اٹھی رہے وہ کیسے اپنے عیوب دیکھنے کے قابل ہو سکتی ہے ۔ جس کے بعد یہ سانحہ پیش آتا ہے کہ دوسرے تک دین پہنچانے اوران پر دین نافذ کرنے کے علمبرار اپنی ذاتی زندگی میں فکر و عمل کی طر ح طرح کی آلائشوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ایسے لوگ اپنی اصلاح کو کوئی کام نہیں سمجھتے ۔ مسئلہ یہ ہے کہ انسانی اصلاح کوئی ایک دن کا کام نہیں ۔یہ ساری زندگی کا کام ہے ۔ پھر اصلاح نفس کے اتنے گوشے ہیں کہ یہ ہمہ وقت انسان کی توجہ چاہتے ہیں ۔انسان کا عمل، اس کا ردعمل، اس کی شخصیت، اس کی نفسیات، اس کی عادات غرض ہر چیز ہر وقت احتساب کا مطالبہ کرتی ہے ۔مگر دوسروں کو دیکھتے رہنے والوں کو یہ علم ہی نہیں ہو پاتاکہ کون سی خرابی کس راہ سے ان کے اندر داخل ہوگئی ہے ۔ چنانچہ وہ ساری دنیا میں چراغ جلاتے ہیں ، مگر ان کے اپنے

اندر اندھیرے جگہ بنالیتے ہیں ۔ وہ ساری دنیا کو وعظ کرتے ہیں ، مگر ان کے دل کی سماعتوں کے دروازے بند ہوجاتے ہیں ۔
یہاں خیال رہے کہ یہ آیت امر بالعروف و نہی عن المنکر یا تواصو بالحق کے حکم کو منسوخ نہیں کر رہی، بلکہ اس حکم کی حد بندی کر رہی ہے ۔ یہ بتا رہی ہے کہ دوسرے کو نیکی کرنے اور برائی سے رکنے کی تلقین ، بس تلقین تک محدود رہنی چاہیے ۔کسی نے مان لیا تو بہت اچھی بات ہے ۔ نہیں ماناتو ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں کہ کسی کے سر پر سوار ہوجائیں ۔اس کی گمراہی نہ دنیا میں ہمارا کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ آخرت میں ۔ ہمیں بس حق کی شمع روشن رکھنی ہے ۔ سچ اور حق بتارتے رہنا اور دلسوزی سے نصیحت کرنی ہے ۔ دوسروں پر دین ٹھونسنا، جبر کرنا، زبردستی منوانا یہ دین کی روح کے بالکل خلاف ہے ۔
حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اس ایک آیت کو سمجھ لیا۔ وہ ذاتی ارتقا کے ختم نہ ہونے والے راستہ پر چل پڑ تا ہے ۔اس کی شخصیت بے مثل شخصیت بننے لگتی ہے ۔ جس کے نتیجے میں ہر روز جنت میں اس کا مقام بلند ہوتا چلا جاتا ہے ۔ یہی ایک مومن کا ہدف ہونا چاہیے ۔

چند لمحوں میں

یہ سن 1998کا ذکر ہے ۔میں اس زمانے میں جدہ میں مقیم تھا۔میں اپنے گھر والوں کے ہمراہ ساحل سمند ر گیا ہوا تھا۔ہم ساحل پر ایک ایسی جگہ تھے جہاں وقفے وقفے سے انتہائی تیز رفتار لہریں چٹانی پتھروں سے آ کر ٹکراتیں ۔کچھ دیر کو لہریں کم ہوئیں تو میں پتھروں پر چلتا ہوا آگے بڑ ھتا چلا گیا۔ کچھ آگے پہنچا تو دوبارہ تیز لہریں اٹھنے لگیں ۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں سخت مشکل میں پھنس گیا ہوں ۔کسی وقت بھی کوئی بڑ ی لہر اٹھتی ، مجھے پتھروں سے ٹکرا کر بے دم کرتی اور ساتھ بہا کر لے جا سکتی تھی ۔
ایک لمحے میں خوف میرے اوپر سے نیچے تک تیر گیا۔نہ اپنی جگہ کھڑ ا رہنا ممکن تھا نہ واپس جانا۔مگر اس لمحے بجائے اس کے کہ میں بدحواس ہوتا اللہ کی طرف سے مدد ہوئی اور میری نظر قریب موجود ایک بڑ ے چٹانی پتھر پر پڑ ی جو میرے قد کے برابر تھا۔میں تیزی سے اس کی طرف بڑ ھ گیا۔ لہریں اس چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ رہی تھیں اور میں ان کی پہنچ سے دور اطمینان سے اس چٹان کی آڑ میں کھڑ ا ہو گیا۔تھوڑ ی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ لہریں کچھ وقفہ کے بعد کم ہوجاتی ہیں اور میں اس وقفہ میں واپس جا سکتا ہوں ۔ چنانچہ میں اطمینان سے کھڑ ا انجوائے کرتا رہا اور جب دل بھرگیا تو ایسے ہی وقفہ میں واپس ساحل پر چلا گیا۔
میں جب واپس آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ کی عنایت سے میں نے ہزاروں برس پر پھیلے فکرانسانی کے ارتقاکو چند لمحوں میں سمجھ لیا ہے ۔انسانی فکراپنی تاریخ میں تین مرحلوں سے گزری ہے ۔ ایک مرحلہ شرک کا ہے ۔ اس مرحلے میں انسان نے کائناتی قوتوں اور مخلوقات کے مقابلے میں اپنی کمزوری کو دیکھا۔ وہ ان سے خوفزدہ ہو گیا ۔جس کے بعد وہ مخلوقات کے سامنے سجدہ ریز ہوکر ان کو معبود بنابیٹھا۔میں جس وقت لہروں کی زد میں تھا میں نے انسان کے اِسی خوف کو دریافت کیا تھا۔میں نے سمجھ لیا کہ زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر بنی

اسرائیل کے عروج کے دور تک دنیا کس خوف میں مبتلا ہوکر غیر اللہ کی پرستش کرتی تھی۔
فکر انسانی کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے وحی پر مبنی تہذیب کو عالمی تہذیب بنادیا اور پیغمبروں اور ان کی امتوں کے ذریعے سے دنیا کو توحید کا پیغام پہنچا۔ یہ دور ہزار قبل مسیح سے لے کر تقریبا اٹھارہویں صدی عیسوی تک کے دور پر محیط ہے ۔ اس دور میں لوگ آسمانی وحی کی روشنی میں جیتے تھے اور صراط مستقیم پر چلتے تھے ۔ میرے لیے یہ وہ لمحہ تھا جب اللہ کی عنایت نے میری بالکل درست رہنمائی کی اور میں گھبرانے کے بجائے بالکل صحیح چٹان کے پیچھے جا کر کھڑ ا ہو گیا۔
انسانیت کا تیسرا دور انکار خدا کا دور ہے ۔ یہ وہ دور ہے جس میں انسانیت نے یہ سمجھ لیا کہ دنیا عالم اسباب ہے اور وہ کون سے اسباب ہیں جن کے ذریعے سے فطرت کی طاقتوں کو لگام ڈال کر اپنے کام میں لایا جا سکتا ہے ۔ انیسو یں صدی سے جاری اس دور میں انسان مزے سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے ۔ ہواؤں ، سمندروں ، زمین و آسمان اور سرد و گرم موسم کو مسخر کر کے زندگی کو انجوائے کر رہا ہے ۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے لہروں کے آنے جانے کے وقفے اور واپسی کے درست راستے اور وقت کو مکمل طور پر سمجھ لیا تھا۔ جس کے بعد میں سمندر اور موجوں کو انجوائے کرنے لگا۔
حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں یہ مراحل آتے ہیں ۔ کبھی وہ مشکلات میں گھر جاتا ہے ۔ایسے میں وہ غیر اللہ کے پیچھے دوڑ تا ہے ۔ کبھی زندگی اسے اپنے قابو میں لگتی ہے اور وہ اسے بھرپور انجوائے کرتا ہے ۔ مگر اس لمحے وہ اللہ کو مکمل طور پر بھولا ہوا ہوتا ہے ۔ مگر عقلمند انسان وہ ہوتا ہے جو مشکلات کے طوفان میں گھر نے کے بعد بھی صرف اللہ کی طرف رجوع کرے ۔ اور جب وہ آسانی میں ہو تب بھی خدا کو نہ بھولے ۔ جس نے یہ کر لیا وہی بندگی کی صراط مستقیم پر سیدھا چل کر جنت الفردوس کی منزل تک جاپہنچے گا۔

سلسلہ روز و شب

ابویحییٰ

اسلام پر ایک نیا حملہ

اسلامو فوبیا

اس وقت دنیا بھر میں اور خاص کر مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کے دائیں بازو اور انتہا پسندمذہبی طبقات کی طرف سے ایک زبردست مہم جاری ہے ۔ یہ مہم جسے عام طور پر اسلامو فوبیا کا نام دیا جاتا ہے ، مغربی ممالک میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچی ہوئی ہے ۔
مغربی دنیا اورسو ویت یونین کے درمیان سرد جنگ میں مسلمان بالعموم مغرب کے حلیف تھے ۔ اس زمانے میں مغربی دنیا میں مسلمان تارکین وطن کو عام طور پر بہت خوش آمدید کہا گیا۔ یوں مسلمانوں کی آبادی مغرب میں بڑ ھتی گئی۔ان تارکین وطن کے اثر سے اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر اسلام مغرب میں تیزی سے پھیلنے لگا ۔تاہم سرد جنگ کے خاتمے کے بعد مغربی ممالک کے انتہا پسند طبقات میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ اسلام یہاں تیزی سے اپنی جگہ

بنا رہا ہے ۔چنانچہ نوے کی دہائی میں پہلی دفعہ اسلامو فوبیا کی اصطلاح کی بازگشت سنائی دی۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد اس کی گونج نمایاں ہوئی اور حالیہ برسوں میں دہشت گردی کے پے در پے واقعات اور ہمارے بعض فکری اورمذہبی طبقات کی طرف سے ان کی علانیہ اور غیر علانیہ حمایت کی بنا پر مغربی انتہا پسند طبقات کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اسلام کے خلاف اسلامو فوبیا کی ایک مکمل اور بھرپور فکری جنگ شروع کر دیں ۔
اسلامو فوبیا کی یہ جنگ جس خوف سے لڑ ی جا رہی ہے وہ مسلم ممالک یا وہاں رہنے والے مسلمانوں کا خوف نہیں ہے ۔ بلکہ مغرب کے انتہا پسند طبقات کو اصل خوف اسلام کی اس دعوتی قوت سے ہے جو تیزی سے مغرب میں اسلام کے فروغ کا سبب ہے ۔ اسلامی دعوت کا عمل اگر اسی طرح جاری رہتا تو اکیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں اسلام اکثریتی مذہب بن جاتا ۔ چنانچہ دہشت گردوں کی کاروائیوں کا فائدہ اٹھا کر مغربی انتہا پسند طبقات نے اسلام کے خلاف ایک انتہائی خوفناک مہم شروع کر دی ہے ۔اس مہم کے ذریعے سے نہ صرف ایک مغربی شخص کے سامنے اسلام کا ایسا چہرہ رکھا جا رہا ہے جو اسلام کو ایک ناقابل قبول مذہب بنادے بلکہ بہت سے مسلمانوں کے دل ودماغ میں بھی شکوک و شبہات کے بیج بوئے جا رہے ہیں ۔

ایک مکروہ الزام

اس مہم کے بہت سے پہلو ہیں ۔ ایک پہلو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ ہستی کے حوالے سے بعض ایسی بے ہودگیوں کا انتساب ہے جس کا تصور ہم ایک عام انسان کے لیے بھی بہت برا سمجھتے ہیں ۔باخدا میرا دل نہیں چاہتا کہ اس طرح کی بے ہودگیوں کو قرآن مجید اور سیرت پاک کے دفاع کے لیے اشارۃًبھی نوک قلم پر لاؤں لیکن جب کوئی شخص ہماری طرف کیچڑ اچھالتا ہے تو مجبوراً اس کیچڑ کو دھونے کے لیے اس میں ہاتھ ڈالنے پڑ تے ہیں ۔
یہ بے ہودہ الزام جو بہت پھیلا یا جا رہا ہے اس حوالے سے ہے کہ اسلام بچوں سے جنسی تعلقات کی اجازت دیتا ہے ۔مغربی انتہا پسند اس حوالے سے قرآن مجید کے ایک بیان اورشادی کے وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے حوالے سے جو کچھ بے ہودگیا ں تخلیق کرتے ہیں اور ہمارے بعض اہل علم جس طر ح سادگی میں ایسی باتوں کی تائید کر دیتے ہیں ، وہ ہمارے سنجیدہ طبقات کو خود اسلام اور پیغمبر اسلام کی شخصیت کے بارے میں سنگین سوالات اٹھانے پر مجبور کر دیتے ہیں ۔اس لیے مجبور ہوکر ان بے ہودہ الزامات کو نقل کیے بغیر میں صرف علمی نوعیت کی کچھ وضاحتیں کرنا چا ہوں گا۔ یہ وضاحتیں قرآن و حدیث کے حوالے سے ہیں ۔ معاندین اسلام قرآن و حدیث کے علاوہ مسلمان مفسرین کی تشریحات اور مسلمان اہل علم کے فتاویٰ بھی اس بات کی تائید میں نقل کرتے ہیں کہ اسلام چھوٹی بچیوں سے جنسی تعلق کی اجازت دیتا ہے ۔مگر ظاہر ہے کہ مسلمان اہل علم کی آراء کا دفاع کرنا ہمارا کام ہے نہ اس کی ضرورت ہے ۔ جب اصل بات واضح ہوجائے گی تو مزید کسی بحث و مباحثے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

قرآن مجید کے بیانات

قرآن مجید کے جس بیان کو چھوٹی بچیوں سے جنسی تعلق کے جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ، میں اس پر گفتگو کرنے سے قبل یہ واضح کرنا چا ہوں گا کہ قرآن مجید ایک دوسرے مقام

پر یہ بات خود ہی واضح کر دیتا ہے کہ شادی بچپن کی چھوٹی عمر کا معاملہ ہرگز نہیں ہے ۔ارشاد ہے :
''اورتم وہ مال، جس کوخدا نے تمھارے لیے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے ، نادان یتیموں کے حوالے نہ کرو، ہاں ان کو اس سے فراغت کے ساتھ کھلاؤپہناؤ اور دستور کے مطابق ان کی دلداری کرتے رہو، اوران یتیموں کوجانچتے رہویہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمرکوپہنچ جائیں تواگرتم ان کے اندرسوجھ بوجھ پاؤتوان کامال ان کے حوالے کر دو۔اور(اس ڈرسے)کہ وہ بڑ ے ہوجائیں گے اسراف اورجلدبازی کر کے ان کامال ہڑ پ نہ کرو۔'' (نسائ4:5-6)
اس آیت میں شادی کی عمر کا کوئی سن تو نہیں دیا گیا ہے اس لیے کہ انسانو ں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ شادی کی عمر کیا ہوتی ہے ۔ لیکن ایک ایسا واضح قرینہ موجود ہے جو اس بات کی قطعی نفی کر دیتا ہیں کہ اسلام کسی نابالغ بچی سے جنسی تعلق کی اجازت دیتا ہے ۔ ان آیات میں قرآن مجید نے یتیموں کے اموال ان کے حوالے کرنے کے لیے ''نکاح کی عمر ''کی حد مقرر کی ہے ۔ معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ چھوٹے بچوں کے نکاح کی عمر تک پہنچنے کی جب بھی بات کی جائے گی اس سے مراد جنسی بلوغت ہو گی۔تاہم کوئی نہ سمجھ سکے تو اس کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ نکاح ، جنسی تعلق قائم کر کے اپنی نسل جاری رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے ۔ یہ کام فریقین کی جنسی بلوغت کے بغیر ہونہیں سکتے ۔ اس لیے جب بھی کسی بچے کے لیے کہا جائے گا کہ یہ نکاح کی عمر کو پہنچ گیا ہے اس سے مراد یہ ہو گی کہ وہ جنسی بلوغت کو پہنچ گیا ہے اور نابالغ نہیں رہا ہے ۔
گویا کہ قرآن مجید کا مدعا یہ ہے کہ نکاح کی عمر وہ ہوتی ہے جب کوئی بچہ بچپنے کی حدودسے نکل کر ، اگر لڑ کی ہے تو نسوانیت اور لڑ کا ہے تو مردانگی کے دور میں داخل ہوجائے ۔قرآن مجید نے اپنے اس مدعا کو اس طرح بھی موکد کیا ہے کہ اسی آیت یعنی آیت چھ میں ''بڑ ے ہوجانے ''کو اس کے مترادف اور آیت پانچ میں بچپنے کی چھوٹی عمر کوجس میں بچہ نادان ہوتا ہے اس کے بالمقابل استعمال کیا ہے ۔اس طرح اس نے اپنے باکمال اسلوب میں یہ حقیقت بالکل کھول دی ہے کہ نکاح کی عمر وہ ہوتی ہے جس میں ایک بچہ یا بچی بچپن کی ناسمجھی سے نکل کر جوانی کے بڑ ے پن میں داخل ہوتا ہے ۔ یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ قرآن مجیدشادی کو بچپن اور جنسی بلوغت سے قبل کا کوئی معاملہ نہیں قرار دیتا بلکہ بڑ ی عمر کا معاملہ سمجھتا ہے جب بچوں پر بڑ وں کا اطلاق ہونے لگتا ہے ۔
سردست اس آیت کے حوالے سے اتناہی کہ ہم نے اس آیت پر آگے مزید بات کی ہے ، تاہم ایک نکتہ یہاں مزید واضح کرنا ضروری ہے ۔ وہ یہ کہ اسی سورہ نساء میں مہر کو شادی کی شرط کے طور پر بار بار بیان کیا گیا ہے ۔مہر کے متعلق معلوم ہے کہ یہ مالی ادائیگی کا معاملہ ہے ۔ یعنی یہ مال ہے جو دولہا دلہن کی مالی ذمہ داریاں اٹھانے کے عہد کے طور پر بطور ٹوکن شادی سے قبل یا اسی موقع پر اسے دیتا ہے ۔سوال یہ ہے کہ قرآن چھوٹے بچوں کو ان کے اپنے مال دینے سے تو منع کر رہا ہے ، وہ ان کو اسی چھوٹی عمر میں نکاح جیسے معاہدے میں دھکیلنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے جس کے متعلق اس کا بار بار اصرار ہے کہ یہ مال دے کر کیا جائے ۔
اس لیے ہمارے نزدیک اِس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ''حتی بلغوا النکاح '' الفاظ استعمال کر کے یہ بتادیا ہے کہ جنسی بلوغت سے پہلے بچپنے کی عمر نکاح کی عمر نہیں ہے ۔

قرآن پر نالغ بچیوں سے جنسی تعلق کی اجازت کے الزام کی حقیقت
اب آئیے اس آیت کی طرف جس کی بنیاد پر معاندین اسلام یہ الزام لگاتے ہیں کہ چھوٹی بچیاں جن کو حیض نہ آیا ہو ان سے جنسی تعلق کی اجازت ہے ۔ یہ سورہ طلاق (65)کی آیت نمبر 4 ہے ۔ ارشادباری تعالیٰ ہے ۔
''اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ، اگر ان کے باب میں شک ہو تو، ان کی عدت تین مہینے ہے ، اور (اسی طرح)ان کی بھی جن کو حیض نہ آیا ہو۔''
شبلی نے کہیں لکھا تھا کہ مستشرقین جو بھی کالک اسلام کے روشن چہرے پر لگائیں ، اس کے لیے سیاہی ہم مسلمان ہی ان کوفراہم کرتے ہیں ۔ یہی حال اس آیت کا ہے ۔ہمارے بہت سے اہل علم یہ رائے رکھتے ہیں اور اس آیت کے ذیل میں بیان کرتے ہیں کہ جن چھوٹی بچیوں کو حیض نہ آیا ہویہ آیت ان ہی سے متعلق ہے ۔ اور اس کی رو سے ان سے جنسی تعلق قائم کرنا درست ہے کیونکہ یہاں عدت کا حکم بیان ہورہا ہے اور عدت صرف اسی خاتون کی ہوتی ہے جس کے ساتھ شوہر تعلق قائم کر چکا ہو۔چنانچہ معاندین اسلام یہ آیت اٹھاتے ہیں اور اس کی روشنی میں ہر جگہ یہ بات پھیلاتے ہیں کہ دیکھو قرآن تو چھوٹی بچیوں سے جنسی تعلق کی اجازت دیتا ہے ۔ اس کا جو ردعمل ہوتا ہے اس کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے ۔
ہمارے نزدیک قرآن مجید جوبات کر رہا ہے اس کا سادہ ترین مطلب یہ ہے کہ جو خواتین حیض کی عمر کو پہنچ چکی ہوں لیکن کسی مسئلے کی وجہ سے ا ن کو حیض نہ آیا ہو ان کی عدت تین ماہ ہے ۔ اس سے مراد وہ چھوٹی بچیاں ہیں ہی نہیں جو حیض کی عمر کو نہ پہنچی ہوں ۔ ہمارے نزدیک سیاق کلام اس کے سوا کسی دوسرے مفہوم کی اجازت نہیں دیتا۔یہ آیت ''من نسائکم'' یعنی تمھاری عورتوں کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے ۔ لفظ عورت کا اطلاق کسی صورت ایک نابالغ لڑ کی پر نہیں ہو سکتا جب تک کہ کوئی بالکل واضح قرینہ یا موقع محل نہ ہو۔ یہاں سرے سے کوئی قرینہ ہی نہیں ہے کہ یہاں ''النسائ'' سے نابالغ لڑ کیاں مراد لی جائیں ۔بلکہ اس کے برعکس طلاق، عدت، اور حیض جیسی اصطلات استعمال ہوئی ہیں جوبلوغت تک پہنچی ہوئی خواتین سے متعلق ہوتی ہیں ۔چنانچہ یہاں ''النسائ'' کا لفظ صرف بالغ عورتوں کے لیے محدود ہو چکا ہے ۔
بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ قرآن مجید کی روشنی میں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تین حیض یا تین ماہ کی عدت کا مقصد یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ خاتون حمل سے ہے یا نہیں ۔ کیونکہ سورہ احزاب (49:33)میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جس خاتون سے تعلق زن و شو قائم نہ ہوا ہو اس کی کوئی عدت نہیں ۔اب مسئلہ یہ ہے کہ جو بچی اپنی کم عمری کی بنا پر بلوغت کو نہیں پہنچی وہ کسی صورت حاملہ ہو ہی نہیں سکتی۔یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے ۔ اس کو عدت گزارنے کا حکم تو دیا ہی نہیں جا سکتا۔اس لیے ایک نابالغ لڑ کی کسی طور اس حکم کی مخاطب نہیں ہو سکتی۔
چنانچہ سیاق کلام نص قطعی ہے کہ یہاں جن خواتین کے حیض نہ آنے کا ذکر ہے ان سے مراد بالغ لڑ کیاں ہیں جن کو جسمانی بلوغت اور نسوانی شباب کے تمام دیگر آثار ظاہر ہونے کے باوجود حیض نہ آیا ہو۔یہاں کسی صورت وہ بچیاں مراد نہیں جو حیض کی عمر کو پہنچی ہی نہ ہوں ۔ ورنہ اگر یہی مفہوم مراد لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیض تو تین سال، تین ماہ ، تین دن بلکہ تین گھنٹے پہلے پیدا ہونے والی بچی کو بھی نہیں آیا ہوتا۔ اگر مراد یہی ہے تو پھر تین

گھنٹے کی بچی سے مقاربت کے اس عمل کو جس کی شناعت کو بیان کرنے کے لیے کوئی لفظ ایجاد نہیں ہوا ، اس کے جواز کا فتویٰ کیوں نہیں دیا جا سکتا۔اگر یہ بات واضح ہے تو کم از کم کوئی مسلمان مفسر تو آئندہ اس سے یہ مفہوم مراد نہیں لے گا۔ رہے معاندین ان کا اس دنیا میں کوئی علاج نہیں ۔

یہاں ایک معترض دو سوالات اٹھا سکتا ہے ۔ ایک یہ کہ جن خواتین کو حیض کی عمر کو پہنچنے پر بھی حیض نہ آیا ہو ان کا ذکر آیت کے پہلے حصے میں ''اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں '' کے الفاظ سے آ چکا ہے ، اس لیے جن کو حیض نہ آیا ہوسے وہ مراد نہیں ہو سکتیں ۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر بچیوں کے لیے ''النساء '' کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ اس لیے یہاں بھی النسا ء میں بچیوں کو شامل کرنا غلط نہیں ۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے اعتراضات محض کج بحثی کے سوا کچھ نہیں ۔ حیض سے مایوس ہونے کے الفاظ سے ذہن صرف ان خواتین کی طرف منتقل ہوتا ہے جو بڑ ی عمر کو پہنچ چکی ہوں اور ان کا جسمانی نظام اب حیض لانے سے قاصر ہو چکا ہو۔ ایک جوان عورت جسے کسی عارضے یا نقص کی بنا پر حیض نہ آیا ہواس کے لیے یہ الفاظ درست نہیں ۔ ہو سکتا ہے کچھ عرصے بعد ، حمل اوربچوں کی پیدائش کے بعد، علاج معالجے کے بعد اسے حیض آجائے ۔ اس کے لیے مایوس ہونے کی اصطلاح کسی طور موزوں نہیں نہ قرآن میں یہ اس سے مراد ہے ۔

رہا دوسرا سوال تو بے شک قرآن مجید نے اس واقعے کے بیا ن کے لیے جب فرعون نے بنی اسرائیل کی بچیوں کو چھوڑ کر ان کے نومولود بچوں کو قتل کرنا شروع کیا تھا ، استعمال کیا ہے ۔مگر وہاں ہر جگہ ایک بالکل واضح قرینہ ہے کہ یہاں ''النسائ'' یعنی عورتیں بول کر بیٹیاں مراد لی جا رہی ہیں ۔ وہ یہ کہ یہ لفظ ہر جگہ ''ابنائ'' یعنی بیٹوں کے لفظ کے بالمقابل آیا ہے ۔یہی نہیں بلکہ یہ تاریخی پس منظر بھی مخاطبین کو معلوم تھا کہ اصل واقعہ کیا تھا ۔ اس لیے کسی کو قرآن مجید کے حوالے سے کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی۔اب رہا یہ سوال کہ قرآن مجید نے یہ لفظ استعمال ہی کیوں کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعو ن کے پیش نظر یہ تھا کہ غلام قوم کی یہ بچیاں زندہ رہ کر عورتوں کی عمر کو پہنچیں اور پھر ہماری خادمائیں بنیں ۔دوسرا سبب وہی ہے جسے صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی نے بیان کیا ہے بنی اسرائیل کی غیرت کو حرکت میں لانے کے لیے یہ تعبیر زیادہ موثر تھی، (1/211)۔ چنانچہ قرآن مجید نے انتہائی بلیغ طور پر ''النساء ''کا لفظ ''ابنائ'' کے بالمقابل استعمال کیا۔ جس سے نہ صرف اصل بات بیان ہوگئی بلکہ فرعون کے ظلم اوراللہ کے احسان کی نوعیت بھی پوری طرح واضح ہوگئی کہ فرعون نے ان کی جو بچیاں چھوڑ ی تھیں بطور احسان نہیں چھوڑ یں بلکہ اس لیے چھوڑ یں کہ ایک روز یہ بچیاں جوان عورتیں بن کر مصریوں کے گھروں اور بستروں کی زینت بنیں ۔ اللہ تعالیٰ اگر ان کو فرعون کی غلامی سے نجات نہ دیتے تو یہی ان کا مقدر تھا۔ اس طرح ''تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے '' کے الفاظ سے جو بات سمجھائی گئی وہ کبھی تمھاری بچیوں کو زندہ رکھتے کہ الفاظ سے واضح نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت عائشہ کی شادی کی عمر

یہ معاملہ تو قرآن مجید کا تھا۔ سیرت کے حوالے سے سیدہ عائشہ کی شادی کے وقت ان کی جو عمر بعض روایات میں بیان ہوئی ہے اس سے بھی یہ معاندین وہ مضامین اخذ کرتے ہیں جو

ناقابل بیان ہیں ۔ہم کافی پہلے اسی نوعیت کے اس سوال کے جواب میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں ۔ قارئین کے لیے وہ تحریر بعینہ درج ذیل نقل ہے ۔

روایات میں یہ بات آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر 6برس اور رخصتی کے وقت 9برس تھی۔مگر یہ روایات قرآن ، حدیث، تاریخ اور عقل عام سب کے خلاف ہیں ۔بہت سے اہل علم نے اپنی کتابوں مثلاًحکیم نیاز احمد نے کشف الغمۃ عن عمر ام الامۃاور علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی نے ’عمر عائشہ ‘میں تفصیل کے ساتھ بحث کر کے ان سارے دلائل کو جمع کر دیا ہے جن سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نکاح کے وقت سیدہ کی عمر وہ نہیں تھی جو بیان کی جاتی ہے ، بلکہ وہ ایک بالغ اور نوجوان خاتون تھیں ۔نکاح کے وقت ان کی عمر سولہ برس اور رخصتی کے وقت انیس برس تھی۔مگر راوی نے اسے غلطی سے چھ اور نو بنادیا۔اس کا سبب یہ ہے کہ عربی زبان میں دس سے اوپر کے اعداد کو ایک مرکب عدد کے طور پر بولا جاتا ہے ۔انگریزی میں یہ بیس کے بعد ہوتا ہے ۔ اس لیے اکیس کے عدد کو Twenty one کہتے ہیں ۔اسی طرح عربی میں دس سے اوپر یہی اصول ہے ۔چنانچہ سولہ کا ہندسہ الفاظ کی شکل میں ست عشرۃ اور انیس کا ہندسہ تسع عشرۃکے طور پر بیان کیا گیا ہو گا جسے راوی کی غلطی نے ست(6) اور تسع(9) بنادیا۔تفصیل کے لیے آپ مذکورہ بالاکتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں ۔ہم ذیل میں آپ کی سہولت کے لیے چند اہم نکات قرآن ، حدیث، تاریخ اور عقل عام کے حوالے سے بیان کیے دیتے ہیں ۔

* قرآن کریم کا بیان

قرآن کریم میں کہیں براہِ راست تو یہ بیان نہیں ہوا کہ نکاح کی عمر کیا ہوتی ہے ، مگر نکاح کی عمر کی دو خصوصیات کی طرف ذیل کی آیت میں واضح اشارہ کر دیا گیا ہے ۔

’’اوران یتیموں کوجانچتے رہویہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمرکوپہنچ جائیں تواگرتم ان کے اندرسوجھ بوجھ پاؤتوان کامال ان کے حوالے کر دو۔اور(اس ڈرسے)کہ وہ بڑ ے ہوجائیں گے اسراف اورجلدبازی کر کے ان کامال ہڑ پ نہ کرو۔‘‘، (نسائ4:6)

اس آیت کے مطابق نکاح کی عمر وہ ہوتی ہے جس کے بعد انسان میں ’۔رشد‘ یعنی سمجھ پیدا ہوجائے ۔ یہاں اس سمجھ سے مراد مالی معاملات کی نگرانی کی سمجھ ہے ۔ کیونکہ یہ آیت یہی بتا رہی ہے کہ یتیموں کے مال نکاح کی عمر میں پہنچنے پر ان کے حوالے کر دو۔دوسری بات یہا ں یہ بیان کی گئی ہے ان کے بڑ ے ہونے کے خوف سے ان کے مال جلدی جلدی نہ کھابیٹھو۔ یہ ’بڑ ا ہوجانا‘ وہ دوسرا اشارہ ہے جو نکاح کی کم از کم عمر کو بیان کرتا ہے ۔ یعنی اس انسان پر بچے کا اطلاق نہ کیا جا سکے ۔جن لوگوں نے کبھی غور سے کسی نو سال کی بچی یا بچے کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ نو سال کے بچے میں نہ مالی معاملات چلانے کی سمجھ ہوتی ہے اور نہ اس پر کسی بڑ ے کا اطلاق کیا جا سکتا ہے ۔اس لیے رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم کسی نو سالہ بچی سے شادی کریں ، یہ چیز قرآن پاک کے اپنے بیان کی رو سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے ۔

* علم وعقل اور مشاہدات کا فیصلہ

قرآن پاک کی درج بالا آیت کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ قرآن نکاح کی عمر سے متعلق کوئی نیا حکم نہیں دے رہا بلکہ انسانوں میں رائج ایک معمول کو بیان کر رہا ہے ۔عرب کے اس زمانے کے جو حالات بھی ہمارے سامنے ہیں ، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے

کہ اس دور میں لڑ کیو ں کے نکاح کی عام عمر وہی تھی جس میں انہیں کنواری نوجوان لڑ کی کہہ کر بلایا جا سکتا ہے ۔ یعنی وہ عمر جسے انگریزی میں Teen Age کہتے ہیں ۔ آج بھی عرب ہو یا عجم اسی عمر میں لڑ کیوں کی شادی عام رواج ہے ۔ ایسے میں اگر سیدہ کی شادی چھ برس اور رخصتی نو برس میں ہوئی تھی اور وہ بھی سرکار دوعالم جیسی ہستی کے ساتھ جن کے دشمن عداوت اور جانثار محبت کے آخری درجہ پر پہنچے ہوئے تھے تو اس کے ساتھ دو واقعات ضرور بیان ہونے چاہیے تھے ۔ایک یہ کہ قریش مکہ اور منافقین مدینہ دونوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اندھے ہورہے تھے ، وہ اس واقعے کے خلاف آسمان سر پر اٹھالیتے ۔اہل عرب میں میاں بیوی کی عمر میں زیادہ فرق ہونا ایک عام بات تھی، لیکن ایک بچی سے شادی کرنا ایسی بات نہ تھی جس پر طوفان نہ اٹھایا جاتا۔
مگر ہم دیکھتے ہیں اس حوالے سے آج کے مستشرقین تو حضور کے خلاف بدگوئی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ، مگر اس دور کے کفار و منافقین خاموش رہتے ہیں ۔دوسری بات جو لازماً ہونی چاہیے تھی وہ یہ کہ سیدہ کی شادی کا واقعہ صرف ایک راوی ہشام بن عروہ بیان نہیں کرتے بلکہ کئی لوگ اس بات کو ایک غیر معمولی واقعے کے طور پر بیان کرتے ۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی بھی کوئی بات نہیں بلکہ یہ پورا واقعہ صرف ایک صاحب ہشام بن عروہ سے مروی ہے ۔وہ بھی اسے اپنی پوری زندگی میں کبھی بیان نہیں کرتے سوائے عمر کے آخری حصے کے جب وہ مدینہ سے عراق منتقل ہوئے ۔ 131ھ کے بعد کا یہ وہ زمانہ ہے جس کے بارے میں تمام محققین یہ کہتے ہیں اس زمانے میں ان کی یادداشت متاثر ہو چکی تھی۔ابن حجر نے تہذیب التہذیب اور حافظ ذہبی نے میزان میں ہشام کے اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔اسی لیے اہل علم ہشام کی ان روایات کو لینے میں بہت محتاط رہتے ہیں جو انہوں نے عمر کے آخری حصے میں عراق میں بیان کیں ۔سیدہ کے نکاح کی روایت ایک ایسی ہی روایت ہے ، مگر چونکہ اس کا تعلق حلال و حرام سے نہیں بلکہ ایک تاریخی بیان سے ہے اس لیے اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ یہ ہمارے اہل علم کا عام طریقہ ہے کہ زیادہ سختی صرف حلال و حرام اور احکام کی روایات پر کرتے ہیں ۔حالانکہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت ہر حلال و حرام سے زیادہ اہم ہے اور اس روایت پر اس پہلو سے غور کیا جانا چاہیے ۔

* احادیث کا بیان

صحیح بخاری ہی میں بعض ایسی احادیث ہیں جو بالواسطہ طور پر سیدہ کی صحیح عمر خود بیان کر دیتی ہیں ۔مثلاًبخاری کتاب التفسیر کی ایک روایت ہے جس میں سیدہ سورہ قمر کی ایک آیت کا حوالہ دے کر کہتی ہیں کہ اس کے نزول کے وقت میں ایک ’جاریۃ‘ یعنی لڑ کی تھی اور کھیلا کودا کرتی تھی۔ سورہ قمر میں شق قمر کا مشہور واقعہ بیان ہو ا ہے ۔اس واقعہ کی بنا پر مفسرین اور محدثین اس سورت کے زمانہ نزول کے بارے میں متفق ہیں کہ یہ سورت نبوت کے پانچویں برس نازل ہوئی۔ ہشام بن عروہ کی روایت کی رو سے سیدہ کی پیدائش 5نبوی میں ہونی چاہیے ۔ گویا ہشام کے مطابق جس سن میں ان کی پیدائش ہونی چاہیے ، بخاری کی اِس روایت کے مطابق ٹھیک اسی سن کا واقعہ سیدہ بیان کرتی ہیں کہ میں اس وقت کھیلنے کودنے کی عمر میں داخل ہوجانے والی ایک لڑ کی تھی۔اس واقعے کے آٹھ برس بعد ہجرت ہوئی اور ہجرت کے ایک دو برس بعد آپ کی رخصتی ہوئی ۔اس حساب سے سورہ قمر کے نزول کے نو دس برس

بعد رخصتی کے وقت آپ لڑ کپن سے نکل کر جوانی کے دور میں داخل ہو چکی تھیں ۔ہمارے نزدیک یہی بات ٹھیک ہے ۔
اس تفصیل کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر ہم ہشام والی روایت کو ٹھیک مانیں گے تو ہمیں بخاری کی اِس روایت کا انکار کرنا ہو گا۔ جبکہ دوسری طرف بخاری و مسلم کی مستند روایات کے مطابق سیدہ جنگ بدر اور احد میں شریک تھیں ۔جنگ احد کے موقع پر آپ ام سلیم کے ہمراہ پانی کے مشکیزے اٹھائے مسلمانوں کو پانی پلاتی پھر رہی تھیں (بخار ی کتاب الجہاد و السیر، باب غزوالنساء وقتالھن مع الرجال)۔ جنگ جنگ ہوتی ہے بچوں کا کھیل نہیں ہوتی۔اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے موقع پر 15برس سے کم عمر بچوں کو جنگ میں شرکت سے منع کر دیا تھا۔ جبکہ سیدہ کی عمر جنگ احد کے وقت ہشام کی روایت کے مطابق گیارہ برس کی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے اتنی کم سنی میں انہیں جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دے دی جائے ۔اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیدہ کی عمر سے متعلق ہشام کی روایت درست نہیں ، بلکہ سیدہ کی عمر نکاح کے وقت زیادہ تھی۔
* تاریخ کا بیان
متعدد تاریخی حوالے بھی یہ بات واضح کرتے ہیں کہ سیدہ کی عمر اس سے زیادہ ہے جتنی ہشام کی روایت میں بیان ہوئی ہے ۔ مثلاًمورخ طبری اپنی کتاب تاریخ طبری میں حضرت ابو بکر کے حالات کے ضمن میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی چار اولادیں تھیں اور سب کی سب زمانہ جاہلیت یعنی اعلان نبوت سے قبل پیدا ہوئیں ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سیدہ 5نبوی کو نہیں بلکہ اس سے کہیں پہلے پیدا ہوئی تھیں ۔یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ اٹھارہ برس تھی۔ مثلاً یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سیدہ اپنی بہن حضرت اسماء سے دس برس چھوٹی تھیں ۔حضرت اسماء کا انتقال ہجرت کے 73سال بعد سو برس کی عمر میں ہوا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کے وقت ان کی عمر 27برس اور نتیجے کے طورپر سیدہ کی 17برس ہونی چاہیے ۔اس بات کو ذہبی نے سیر اعلام النباء میں ، ابن حجر نے تقریب التہذیب میں اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بیان کیا ہے ۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نکاح کے وقت سیدہ کی عمر سولہ برس اور رخصتی کے وقت انیس برس تھی جسے راوی کی غلطی نے چھ اور نو کر دیا۔
ہم نے یہاں چند ہی دلائل بیان کیے ہیں اس لیے کہ سوال کے جواب میں اتنی ہی تفصیل کی جا سکتی ہے ۔تفصیلی دلائل کے لیے آپ حکیم نیاز احمد کیکشف الغمہ اور علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی کی ’عمر عائشہ ‘ اور دیگر کتابیں دیکھ سکتے ہیں ۔
جہاں رہیں بندگان خدا کے لیے باعث رحمت بنیے ، باعث آزار نہ بنیے ۔

پروفیسر محمد عقیل
نفس کی تربیت

میں اور آپ جس ظاہری بدن کے ساتھ اس دنیا میں موجود ہیں یہ محض ایک ڈھانچہ ہے ۔ اس ڈھانچے کے اندر ہماری اصل شخصیت ہے جسے ہم خودی کا نام دیتے ہیں ۔ہمارا ظاہری وجود

عام طور پر ہر دس سال کے بعد تبدیل ہوجاتا ہے اور ہمارے جسم کے سارے خلیات تبدیل ہوجاتے ہیں ۔ اس کے باوجود ہماری خودی وہی رہتی ہے ۔
یہ ہماری باطنی شخصیت یا نفس بظاہر ہمارا اپنا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک سرکش ، تندخو اور آزاد منش کی مانند ہے ۔یہ ایک آوارہ بادل کی طرح اپنی مرضی سے ادھر ادھر گھومنا ، اپنی مرضی سے گرجنا برسنا اور تحلیل ہوناچاہتا ہے ۔لیکن اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔
یہ نفس بے شمار داخلی اور خارجی عوامل سے متاثر ہوتا ہے ۔ہمارے اندر بھوک ، پیاس ، شہوت، غصہ ، چاہے جانے کا احساس اور دیگر داعیات ہوتے ہیں ۔ اگر ان پر قابو نہ پایا جائے تو یہی ہمارے نفس کو آلودہ کر دیتے ہیں ۔مثال کے طور پرجنسی شہوت ایک جبلی اور فطری تقاضا ہے جو انسان کی بقا کے لئے لازمی ہے ۔ لیکن اگر اس تقاضے کو کھلی چھٹی دے دی جائے تو کسی کی عزت محفوظ نہیں رہتی اور انسان چوپائے کی طرح ہر جگہ منہ مارتا پھرتا ہے ۔ یہی معاملہ باقی تقاضوں کا بھی ہے ۔
دوسری جانب ہمار ا نفس باہر کے عوامل سے بھی متاثر ہوتا ہے ۔ اس خارج کے ماحول میں ماحول ماں باپ ، بہن بھائی، دوست احباب اور دیگر لوگ اس نفس پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ انسان کا سب سے بڑ ا دشمن شیطان بھی اسی خارج کے ماحول سے دراندازی کرتا ہے ۔
یہ داخلی اور خارجی ماحول مل کر انسان کی اصل شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ لیکن اللہ نے انسان کو اس پورے معاملے میں تنہا نہیں چھوڑ ا۔ کہیں انسان کے اندر ہی ضمیر یا نفس لوامہ کی ایک چھوٹی سی عدالت لگادی جو قدم قدم پر اسے اس کی غلطیوں پر متنبہ کرتی رہتی ہے ۔ دوسری جانب وحی کے ذریعے انسان کو ان امور پر متعین طور پر راہنمائی فراہم کر دی جس میں اسے ٹھوکر لگنے کا اندیشہ تھا۔
انسان کی شخصیت یا نفس کی مثال ایک سرکش گھوڑ ے کی مانند ہے جس پر سوار بیٹھا ہے ۔ گھوڑ ے کا داخلی نقص اس کی سرکشی ہے جس کی بنا پر ہر دم یہ خطرہ ہے کہ یہ سوار کو منزل مقصود پر لے جانے کی بجائے راستے ہی میں پٹخ دے ۔ گھوڑ ے کے خارجی ماحول میں پرخطر راستے ہیں جن پر چلنے سے گھوڑ ا انکار کر دے ا ور بدک جائے ۔ان خطرات سے نبٹنے کے لئے گھوڑ ے کو تربیت دینا اشد ضروری ہے تاکہ اس کی سرکشی کو ختم کیا جا سکے اور ساتھ ہی ساتھ اسے پرخطر راستوں کا عادی بنایا جا سکے ۔ چنانچہ وحی کی روشنی اور ضمیر کی رہنمائی میں اپنی تربیت ہمارے کرنے کا اصل کام ہے ۔ یہی وہ کام ہے جس کا بدلہ جنت کی ابدی بادشاہی ہے ۔

شمائلہ عثمان

گاما جی

گامافن پہلوانی کی تاریخ کی ایک بڑ ی شخصیت کا نام ہے ۔نام توغلام محمد تھا مگر عرف میں گاما کہلائے 11ستمبر1910ء کو زبسکو جو اپنے وقت کا طاقتور ترین انسان سمجھا جاتا تھا انڈیا

آیا اور پٹیالہ میں گاما جی سے بڑ ا معرکہ ہوا جس میں شکست کا منہ دیکھنا پڑ ا اس معرکہ میں وائسرئے ہند بھی موجود تھے اس فتح کے بعد گاما کا لفظ عام بول چال میں طاقتور انسان کے لیے استعمال ہونے لگا یہی دونو ں پہلوان ایک دفعہ پھر لند ن میں آمنے سامنے ہوئے ایک دفعہ پھر گاما جی نے میدان مار لیا اور عالمگیر شہرت حاصل کی اس کے علاوہ بھی بے شمار بڑ ے معرکے ان سے وابسطہ ہیں ۔
گاما جی جنہوں نے زبسکو کو کئی فٹ ہوا میں اچھال دیا تھا بڑ ھا پے میں ایک مکھی اڑ انا بھی مشکل ہو گیا تھا فن پہلوانی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کی ہومیہ خوراک دو سیر بادام ، دس سیر دودھ اور پندرہ سیر گوشت کی یخنی تھی دو تین ہزار ڈنٹر روز پیلتے ہزاروں بیٹھکیں لگاتے لیکن بڑ ھاپے میں ایک پیالی دودھ حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا تھا پھر آخر کار وقت پورا ہو گیا اور دنیا کا طاقتور ترین انسان موت سے شکست کھا گیا۔
ایسے بے شمار طاقتور، ذہین، خوبصورت اورمشہور لوگوں کی داستانیں بکھری پڑ ی ہیں ۔ فرعون ہو یا نمرود آخر کار سب ہی موت کا نوالہ بنے ۔موتلمحہ بھر میں انسان کو اس کی دولت، طاقت ، اثرورسوخ سے جدا کر دیتی ہے اور جس طرح خالی ہاتھ انسان آیا تھا ویسے ہی دنیا چھوڑ کر خالی ہاتھ واپس جاتا ہے ۔لیکن درحقیقت وہ خالی ہاتھ آتا ضرور ہے لیکن جاتا اپنے نامہ اعمال کے ساتھ ہے اس کی کمائی ہوئی دولت چاہے دھن ہو محبت ہو شہرت ہو عزت ہو اولاد ہو علم ہو یا عمل سب کے استعمال کے بارے میں اللہ کی بارگاہ میں حساب دینا ہے اور جس کا نتیجہ داہنے ہاتھ میں آئے گا وہ اس ابدی دنیا کا گاما ہو گا۔

سوال و جواب

بنت عتیق /ابویحییٰ

برے لوگوں کی نفرت

سوال: السلام علیکم

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے ۔ سر آپکی دعاوں سے زندگی کافی بدلی ہے مگر ایک مسئلہ موجود ہے ۔ وہ یہ کہ اچھائی کے راستے پر چلنا شروع کر دیا ہے مگر کچھ غلط ہوتا ہوا دیکھ کر یا کسی غلط انسان کو دیکھ کر دل میں اس کے لیے نفرت سی پیدا ہوجاتی ہے ۔ اس کا کیا کیا جائے ؟

رباء مہر

جواب:وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی نیک تمناؤں اور دعا کے لیے شکریہ ، اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا خصوصی کرم فرمائے ۔
غصہ اور نفرت دونوں تباہ کن حد تک منفی جذبات ہیں ۔ جب ہم صحیح راستے پر ہوں تو غلط رویوں اور اعمال کو دیکھ کر فطرتاً الجھن ہوتی ہے ۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم ٹھیک ہوئے ہیں تو سب ٹھیک ہوجائیں ، اور جب لوگ ہماری بات نہیں سمجھتے تو ان پر غصہ آتا ہے ۔ لیکن ایسے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نفرت گناہ سے کرنی ہے ، گناہ گار سے نہیں ۔ آخر ہم نے بھی تو صحیح راہ کو سمجھنے اور اپنانے میں وقت لگایا، تو انہیں بھی ان کے شعور اور

صلاحیت کے مطابق وقت دینا چاہئے ۔ اور خدا تعالیٰ سے ان کے لیے خیر کی دعا کرنی چاہئے ۔ دعوت کے لیے صبر بہت ضروری ہے ۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ آپ بیک وقت اپنے مدعو سے نفرت بھی کریں اور اسے اسلام کی دعوت بھی دیں ۔ اور اللہ کے عاجز بندے اور اچھے داعی ہر حال میں سراپا صبر و شکر بنے رہتے ہیں ۔ یہی دین کی معراج ہے ۔
نوٹ: اس سوال کا جواب سر ابو یحییٰ کی رہنمائی سے دیا گیا ہے ۔
(بنت عتیق)

دعا قبول کیوں نہیں ہوتی
سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
سر ، دعا کیوں قبول نہیں ہوتی ؟ ہم کب سے کچھ مانگ رہے ہوں اور وہ ملے ہی نہیں تو صبر ختم ہونے لگتا ہے ۔ ایسے میں کیا کیا جائے ؟   سارہ علی
جواب:وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ
پیاری بہن سارہ،
بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہم سب سے زیادہ وسیع ہے اور بے شک وہ کسی بھی واقعے کے ان تمام پہلوؤں سے باخبر ہوتے ہیں جس کا ہمیں گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ ہم نا سمجھی میں اپنے لیے ایک غلط چیز کی فرمائش خدا سے کرنے لگتے ہیں ۔ وہ چیز جو فطرت کے قوانین کے لحاظ سے ہمارے لیے نقصان دہ ہوتی ہے ، چاہے وہ دنیاوی نقصان ہو یا آخرت کا زیادہ بڑ ا نقصان۔ بہرحال ہم اس وقت نقصان کے اندیشے اور نوعیت سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ ایک شفیق ماں کی طرح بظاہر ہمیں ہماری پسند سے دور کر دیتے ہیں مگر دراصل وہ اس نقصان سے ہمیں محفوظ کر رہے ہوتے ہیں ۔ ہم ان کی محبت کو سمجھ ہی نہیں پاتے ۔ ہم پھر بھی یہ چاہتے ہیں کہ وہ فطرت کے قوانین سے بالکل ہٹ کر ’’جادو‘‘ سے ہمارے لیے ہماری پسند کو نفع بخش بنادیں ۔ لیکن ایسا وہ بہت سی وجوہات کی بنا پر نہیں کرتے ۔
اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں ۔ ایک لڑ کی ، کسی شخص سے شادی کی خواہش رکھتی ہے ۔ وہ دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے اس کا ساتھ مانگتی ہے ۔ لیکن وہ شخص ایک بد کردار اور بے ایمان مسلمان ہے ۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ وہ مستقبل میں کس کس طرح اس لڑ کی پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ے گا۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ اپنی بندی کی خواہش پوری کرنے کے لیے اس شخص کو نیک تو نہیں بنا سکتے ۔ کیونکہ یہ اس امتحانی ا سکیم کے خلاف ہو گا جس کے تحت یہ دنیا بنی ہے ۔ اس لیے وہ لڑ کی کو وقتی غم دے کر اسے اس بد کردار شخص سے بچاکر ایک بہت بہتر شخص عطا کر دیں گے ، جو ا س کی دنیا و آخرت دونوں سنوار دے گا۔ لیکن اپنے غم میں لڑ کی کو یہ بات بڑ ی دیر میں سمجھ آئے گی۔
اس کے علاوہ دعا پوری نہ ہونے کی ایک اور وجہ امتحان ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے زیادہ محبت ہے یا اپنی پسند و خواہش سے ۔ لیکن ہمیں یہ یقین ہونا چاہئے کہ وہ ہمیں ہمارے ظرف سے زیادہ کبھی نہیں آزمائیں گے کیونکہ وہ اس دنیا میں ہمیں سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں ۔
اللہ آپکا حامی و ناصر ہو۔

نوٹ: اس سوال کا جواب سر ابو یحییٰ کی رہنمائی سے دیا گیا ہے ۔
بنت عتیق

درود پڑ ھنے کا اجر
سوال: السلام علیکم
سر میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر کوئی بندہ روزانہ 5000 مرتبہ درود شریف پڑ ھے تو اسے قیامت کے دن کیا انعام ملے گا اور برزخ میں اس کے لیے کیا آسانی ہو گی ؟ برائے کرم جواب ضرور عنایت فرمائیں ۔جزاک اللہ۔ شگفتہ نسیم
جواب:وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
درود پاک ان بہترین دعاؤں میں سے ایک دعا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے ۔ یہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری محبت اورعقیدت کی نشانی ہے ۔ ہم دل سے ان پر درود اور سلامتی بھیجتے ہیں اوراللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کو وہ عطا فرمائے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ۔یہ ہمارا ان سے محبت کا اظہار اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے اپنے لیے بھی دعا ہے ۔ اللہ پاک اس کا اجر ضرور عطا فرمائیں گے لیکن یہ درودپاک کی گنتی کر کے متعین ثواب حاصل کرنے کا معاملہ نہیں ہے ۔درود پاک ہمیں زیادہ سے زیادہ جتنا بھی ہم پڑ ھ سکتے ہیں پوری لگن کے ساتھ پڑ ھنا چاہیے لیکن صرف پڑ ھنا ہی نہیں بلکہ ہمیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی معنوں میں امتی بننے کے لیے بھی پوری کوشش کرنی چاہیے ۔ہردرود کے ساتھ ہمیں یہ وعدہ کرنا چاہیے کہ ہم اپنی شخصیت کو ان کی تعلیمات کی روشنی میں بہتر بنائیں گے ۔تب ہی ہم اجر اور خدا کی رحمتیں حاصل کر سکیں گے ۔کیونکہ دین صرف چیزوں کو پڑ ھنے اور نیکی کمانے کا نام نہیں بلکہ یہ ان الفاظ میں موجود حقیقی سپرٹ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اپنے اوپر لاگو کرنے کا نام ہے ۔
نوٹ: اس سوال کا جواب سر ابو یحییٰ کی رہنمائی سے دیا گیا ہے ۔
(بنت عتیق، اردو ترجمہ عبداللہ)

مضامین قرآن

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (18)
دلائل آخرت :آل ابراہیم کی سزا وجزا
حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا منصب
رسولوں کی اقوام کے ضمن میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جن اقوام کے درمیان اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی بعثت ہوجائے ، وہ اسی دنیا ہی میں اس اخروی سزا وجزا کا نمونہ بن جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ ہر فرد کو قیامت کے دن اس کے اعمال کے بدلے میں دیں گے ۔ وہ رسولوں کی بات مان کر ان کے احکام پر عمل پیرا ہوں تو دنیا پر غلبہ و اقتدار پاتی ہیں اور کفر وسرکشی کا

راستہ اختیار کریں تو اس دنیا ہی میں ہلاکت اور تباہی ان کا مقدر ہوتی ہے ۔تاہم یہ معاملہ رسولوں کے براہ راست مخاطبین کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے ۔رسولوں کے بعد ان کی امتو ں کا معاملہ اس اصول پر نہیں کیا جاتا۔وہ اسی طرح پھلتے پھولتے ہیں جس طرح عام اقوام کا معاملہ ہوتا ہے ۔ قطع نظر اس کے کہ ان اقوام میں شرک پھیل جائے ، فسق عا م ہوجائے یا پھر ان کے افراد توحید اور بندگی کے راستے پر گامزن رہیں ، ان کا معاملہ یوم آخرت تک ہی موخر کیا جاتا ہے ۔ یہی وہ سبب رہا ہے کہ بار بار رسولوں کی سزا و جزا اپنی آنکھوں سے دیکھنے والی اقوام پر جب صدیاں گزر جاتی ہیں اور واقعات تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہوجاتے ہیں تو انھی اقوام میں پوری طرح شرک پھیل گیا اور ان پر کوئی عذاب نازل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس قوم میں ایک نئے رسول کی بعثت ہوجائے اور وہ ان کو دعوت حق دینے کے ساتھ تاریخ کے بھولے ہوئے اسباق یاد کرائے ۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے وہ لوگ جن کو ان کے ساتھ نجات دی گئی ، زمین کے سینے پر بسادیے گئے اور وہ مال و اسباب ہر پہلو سے پھلے پھولے ۔مگر ایک مدت کے بعد ان میں شرک کی گمراہی عام ہوگئی تب آل نوح کے ایک حصے میں جو قوم عاد کے طور پر عرب کے جنوبی حصے میں مقیم تھے حضرت ہود علیہ السلام اٹھے ۔قوم عاد پر جب اس کے کفر و سرکشی کی پاداش میں عذاب آیا توصرف حضرت ہود پر ایمان لانے والے بچائے گئے ۔ صدیوں بعد یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی ہوا تو اس کے ایک گروہ میں جس کانام قوم ثمود تھا حضرت صالح علیہ السلام اٹھے ۔

آل ابراہیم کی سزا وجزا

یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ یہاں سے ہدایت کے باب میں سنت الٰہی کے ایک نئے پہلو کا ظہور ہوتا ہے ۔ و ہ یہ کہ حضرات ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے صالحین کو یہ منصب سونپا جاتا ہے کہ ان کے ذریعے سے تا قیامت دنیا میں ایک امت باقی رہے گی۔انبیاء رسل اور کتاب اسی امت میں اتریں گے اور پھر ان کے ذریعے سے دنیا کو اللہ کا پیغام ملتا رہے گا۔البتہ اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا واقعہ بھی ظہور پذیر ہو گا۔ وہ یہ کہ ذریت ابراہیم علیہ السلام کو اسی دنیا میں ان کے خیر و شر کی سزابحیثیت مجموعی ملتی رہے گی۔ وہ خیر پر قائم ہوں گے تو دنیا ہی میں غلبہ و اقتدار ان کا مقدر ہو گا اور اگر نافرمانی اور معصیت کی راہ اختیار کریں گے تو دنیا ہی میں ذلت، محکومی اور عذاب ان کا مقدر ہو گایوں ان کو ملنے والی سزا و جزا معاصرین کے لیے آخرت کا ایک زندہ ثبوت بن کر ہمیشہ سامنے رہے گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کم و بیش دو ہزار برس قبل مسیح میں ہوئی۔ وہ ایک رسول بھی تھے چنانچہ ان کی قوم کو ان کے کفر کی پاداش میں سزا دی گئی۔ پھر ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے بڑ ے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں آباد کریں ۔ جبکہ چھوٹے بیٹے اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کو فلسطین میں بسایا گیا۔ حضرت یعقوب کا لقب اسرائیل تھا اور ان کے بارہ بیٹے تھے ۔ چنانچہ اس مناسبت سے وہ بنی اسرائیل کہلائے ۔ حضرت یعقوب کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام بھی نبی تھے اور ان کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر منتقل ہوئے ۔کئی صدیوں مصر میں رہنے کے بعد یہ لوگ ایک قوم بن گئے ۔ان کے ساتھ مقامی لوگ بھی ایمان لا کر ان کا ہی حصہ بن گئے ۔ ان کوپردیسی کہا جاتا تھا۔ مگر مجموعی طور پر یہ بنی اسرائیل ہی کہلائے ۔

ان بنی اسرائیل میں ایک جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ آپ کے مشن کا ایک حصہ فرعون کودعوت رسالت دینا تھا۔مگر جب اس نے آپ کا کفر کیا تو اس کو ہلاک کر دیا گیا۔ جس کے بعد آپ کی سرکر دگی میں بنی اسرائیل کو مصریوں سے نجات مل گئی۔ اور پھر کوہ طور پر شریعت اور کتاب جیسی عظیم نعمتیں عطا کر کے ان کو وہ منصب دیا گیا جسے قرآن کریم نے ’’سارے جہانوں پر فضیلت دینے ‘‘ سے تعبیر کیا ہے ۔ یہیں سے بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں ایک طرف ان کو دعوت حق کا امین بنایا گیا، ان میں انبیابھیجے گئے ، کتابیں اتاری گئیں اور دوسری طرف ان کو اس سزا وجزا کا ایک زندہ نمونہ بنادیا گیا جو اس سے قبل رسولوں کی اقوام کے ذریعے سے دنیا کو دکھائی جاتی تھی۔ چنانچہ یہود کی تاریخ میں بار بار ایسا ہوا کہ جب ایمان و اخلاق کی دعوت کو انھوں نے رد کیا تو ان پر محکومی، ذلت اور ہلاکت مسلط کر دی گئی اور جب انھوں نے اطاعت و وفاداری کا رویہ اختیار کیا تو دنیا میں عروج و غلبہ ان کا مقدر بن گیا۔یہاں تک کہ جب یہود نے حضرت عیسیٰ کے زمانے میں فیصلہ کن طور پر سرکشی کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازش کرڈالی تو کوہ زیتون کے مقام سے حضرت عیسیٰ کو آسمانوں کی طرف اٹھالیا گیا اور یہود پر تاقیامت ذلت اور محکومی کا فیصلہ کر دیا گیا۔جبکہ حضرت عیسیٰ نے اسی موقع پر یہود کو یہ بتلادیا کہ اب امامت عالم کا منصب یہود سے لے لیا جائے گا اور بنی اسماعیل کو دے دیا جائے گا(متی 46-43:21)۔

قرآن اورتاریخ کی روشنی میں بنی اسرائیل کی سزا وجزا

قرآن کریم کے نزول ساتھ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس پیش گوئی کا ظہور شروع ہو گیا۔قرآن مجید کی سورہ بقرہ اس آسمانی فیصلے کا تفصیلی بیان ہے ۔ اس کے شروع میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعات بیان کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو فضیلت عطاکی ہے وہ دائمی نہیں بلکہ مشروط ہے ۔ انھوں نے جب نیکی کی راہ اختیار کی تو ان کو عزت دی گئی اور جب کبھی نافرمانی کی راہ اختیار کی تو دنیا ہی میں سزا دے کر عبرت کانشان بنادیا گیا۔اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں انسانیت کی رہنمائی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ا ن کی اولاد میں سے صالحین کو دی گئی ہے ۔اس کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہود کو اس منصب سے معزول کرنے کے بعد صحابہ کرام جن کا تعلق بنی اسماعیل سے تھا ان کو یہ منصب عطا کر دیا گیا ہے کہ رسول ان پر گواہ ہوں گے اور وہ انسانیت پر اللہ کے گواہ بن کر کھڑ ے ہوں گے اور قبلہ کی بیت المقدس سے مسجد الحرام کی طرف تبدیلی کو اس کی علامت بنادیا گیا۔

’’ اور اسی طرح (یعنی جس طرح ہم نے بنی اسرائیل کو اس منصب پر فائز کیا تھا)ہم نے تمھیں ایک بیچ کی امت بنایاتاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والابنے ۔‘‘

(البقرہ 2: 143)

سورہ بقرہ کے علاوہ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر بھی یہود کی اس سزا کا تذکرہ ہے جو ان کو تاریخ میں ملتی رہی ہے ۔سورہ اعراف ایسا ہی ایک مقام ہے جہاں ان کی تاریخ میں ملنے والی سزا و جزا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا اعلان ہے جو تاقیامت ان کے بارے میں کیا گیا ہے ۔

''اوریاد کرو جب تیرے رب نے فیصلہ کیا کہ وہ روز قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت برے عذاب چکھاتے رہیں گے ۔ بے شک تیرا رب جلد پاداش دینے والا اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے ۔اور ہم نے ان کو زمین میں منتشر کر دیا گروہ گروہ کر کے ۔ ان میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف بھی۔اور ہم نے ان کو خوشحالیوں اور بدحالیوں سے آزمایا تا کہ وہ رجوع کریں ۔'' (سورہ اعراف167-168:7)
جبکہ ان کی تاریخ کے آغاز پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ذریعے سے ان پر یہ بڑ ی تفصیل سے واضح کر دیا تھا کہ انھوں نے فرمانبرداری اختیار کی تو ان کو دنیا میں غلبہ و اقتدار ملے گا اور نافرمانی کی صورت میں ذلت اور رسوائی ان کا مقدر بنے گی۔ تورات میں یہ قانون بڑ ی تفصیل سے بیان ہوا ہے (استثنا :باب 28)۔قرآن مجید میں اس کا خلاصہ دو جملوں میں اس طرح کیا گیا ہے ۔
اور یاد کرو جب تمہارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر گزار رہے تو میں تمہیں بڑ ھاؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑ ا سخت ہو گا۔ اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم اور وہ سارے لوگ جو روئے زمین پر ہیں ناشکری کرو گے تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑ و گے اور وہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے ۔ (ابراہیم7-8:14)
جبکہ سورہ بنی اسرائیل میں یہود کی تاریخ کے دو اہم ترین واقعات یعنی ان کی سرکشی پر عراق کے بادشاہ بخت نصراور رومی جرنل ٹائٹس کے ہاتھوں آنے والے اس عذاب کی تفصیل ہے جس میں لاکھوں یہودی تہہ تیغ ہوئے اور صدیو ں کی جلاوطنی ان کا نصیب بنی۔
'' اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد مچاؤگے اور بہت سراٹھاؤگے ۔پس جب ان میں سے پہلی بار کی میعاد آئی تو ہم نے تم پر اپنے زورآور بندے مسلط کر دیے تو وہ گھروں میں گھس پڑ ے اور شدنی وعدہ پورا ہوکر رہا۔ پھرہم نے تمھاری باری ان پر لوٹائی اور تمھاری مال و اولاد سے مدد کی اور تمھیں ایک کثیر التعداد جماعت بنادیا۔اگر تم بھلے کام کرو گے تو اپنے لیے اور اگر برے کام کرو گے تو بھی اپنے لیے ۔پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا (تو ہم نے تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیے)تاکہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ وہ مسجد میں گھس پڑ یں جس طرح پہلی بار گھس پڑ ے تھے اور تاکہ جس چیز پران کا زور چلے اسے تہس نہس کرڈالیں ۔ کیا عجب کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمائے ۔ اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے ۔ '' (بنی اسرائیل4-8:17)
سورہ تین قرآن کریم کی وہ سورت ہے جس میں جبل طور جبل زیتون اور اس پر واقع گاؤں تین اور مکہ کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش گیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ذریت ابراہیم کو ان کے ایمان اور کفر کی بنیاد پر جو سزا و جزا دیتے رہے ہیں وہ قیامت کے دن کی سزا کا ایک ثبوت ہے ۔ جبل طور وہ مقام ہے جہاں بنی اسرائیل کو کتاب و شریعت دے کر ایک امت بنایا گیا اور امامت عالم کا منصب دیا گیا۔جبکہ زیتون وہ مقام ہے جہاں رفع مسیح ہوا۔ تین اسی پر واقع ایک گاؤں ہے ۔ جبکہ مکہ وہ شہر ہے جس میں یہود کے بعد بنی اسماعیل کی شکل میں ایک نئی امت کی تاسیس کی گئی۔اس قانون کی تفصیل اور سورہ تین کی تفصیلی شرح کے لیے ملاحظہ ہو میزان(ص 546) از جاوید احمد غامدی۔
''تین اور زیتون کے پہاڑ گواہی دیتے ہیں ، اور طورِ سینین اور(تمہارا)یہ شہرِ امین بھی کہ

انسان کو(اس کی غایت کے لحاظ سے) ہم نے بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے ۔ پھر ہم نے اسے پستی میں ڈال دیا، اِس طرح کہ وہ خود ہی پست ہوا۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ۔ سو اُن کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا۔‘‘ (سورہ تین 95)
جہاں تک بعد از قرآن تاریخ کا تعلق ہے توظاہر ہے کہ اس حوالے سے وحی کا کوئی تبصرہ تو اس میں موجود نہیں جس طرح تاریخ بنی اسرائیل پر قرآن میں تبصرہ کر کے ان کی سزا و جزا کا بیان کیا گیا ہے ۔ لیکن تاریخ کا واضح سبق یہی ہے کہ بنی اسرائیل یعنی یہود اور بنی اسماعیل یعنی عربوں پر سزا وجزا کا یہ قانون آج بھی پوری طرح روبہ عمل ہے ۔اس کے ساتھ جس طرح یہود کے ساتھ بحیثیت امت شامل ہونے والے پردیسی یعنی بنی اسرائیل سے باہر کے یہودی اس سزاوجزا کے قانون کی زد میں آتے رہے ہیں ، اس طرح بنی اسماعیل کے ساتھ امت مسلمہ کا حصہ بننے والے بعض دیگر عرب قبائل اور عجمی گروہ بھی اپنی وابستگی کی بنیاد پر اس قانون کی زد میں آئے ہیں ۔ چنانچہ یہود کو عہد رسالت سے لے کر آج تک مغلوبیت، جلاوطنی اور قتل عالم کا بار بار سامنا کرنا پڑ ا۔ جبکہ امت مسلمہ کو وسط ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں تاتاریوں کے ہاتھوں ، پھر اسپین میں مسیحیوں کے ہاتھوں اور موجودہ دور میں مغربی اقوام کے مقابلے میں محکومی، تباہی اور مستقل ذلت کا سامنا ہے ۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ یہود ہوں یا عرب دونوں گروہ ہی اپنے جرائم کی پاداش میں مغربی طاقتوں کی محکومی اور باہمی جنگ اور تباہی کے مستقل خوف میں جینے پر مجبور ہیں ۔ورنہ پچھلے چار ہزاربرسو ں میں یہی گروہ تھے جو مشرق وسطیٰ اور اردگرد کی متمدن دنیا پر سپر پاور کی طرح حکومت کرتے رہے تھے ۔
یہاں ہمارے پیش نظر یہی بات واضح کرنی تھی کہ ان اقوام کہ سزا و جزا قیامت کے دن کی سزا و جزا کا ایک زندہ ثبوت بن کر دنیا کے سامنے موجود ہے ۔دلائل قران کے ضمن میں اس سے زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے ۔تاہم یہ ایک تفصیلی موضوع ہے ۔ہم نے آل ابراہیم کی اس سزا و جزا اور ان کے بارے میں قانون الٰہی نیز ان کی تاریخ پر بہت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ’’عروج و زوال کا قانون اور پاکستان‘‘ میں گفتگو کی ہے ۔تفصیل کے طالب اس پوری بحث کو اپنے تمام تر پس منظر کے ساتھ وہاں ملاحظہ کرسکتے ہیں ۔
[جاری ہے]

سفیرالاسلام

پانچواں اصول: کھانے پینے اور پہننے میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنا

ایک مسلمان کو کھانے پینے کا مکلف ان احکامات کے ساتھ بنایا گیا ہے ۔
عدم اسراف:
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا
کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ (الاعراف:٣١)
وہ کھائے اور پیے جو نقصان دہ اور حرام نہ ہو اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ کھائے اور پیے

مسلمان اپنے نفس اور اپنے گھر والوں کے معاملے میں اس بات کا مکلف بنایا گیا ہے کہ وہ ان امور پر نظر رکھے ، اس کا تقاضا ہے کہ گھر میں کھانے پینے پر نظر ہو اور اس کو ایک ترتیب دی جائے ۔
کھانے کی نوعیت اور کمیت کو ضرورت دیکھنا چاہے کہ وہ جسم کی ضرورت سے زیادہ نہ ہو، حراروں کی مقدار کو مدِ نظر رکھا جانا چاہیے اسی طرح لحمیات اور وٹامن کے حوالے سے بھی کھانوں کا انتخاب کیا جانا ضروری ہے ۔ کھانا معقول اور مقدار میں معتدل ہونا چاہیے اگر طیب و پاک اور حلال کھائیں گے تو اس میں کوئی نقصان نہیں ، کھانے پینے کی تنظیم روز مرہ کا کام ہے ۔ اس کام کو کرتے وقت گھر کے چھوٹوں اور بڑ وں کی پسند کو مدنظر رکھنا چاہیے حرام کھانے پینے سے بچنے کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ سگریٹ نوشی سے بھی پرہیز کیا جائے ۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بیماری بھی ایسی ہے جس کا علاج بہت ضروری ہے اور وہ ہے پیٹو پن یعنی بہت زیادہ کھانا یا بسیار خوری، کھانے پینے کے معاملے میں افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوناچاہیے بلکہ اس معاملے میں مجاہدۂ نفس کی عادت ڈالنی چاہیے ۔
کھانے پینے کے اہتمام کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے لیکن کھانے پینے کے ضر ر اور نقصان دہ اثرات سے بچاؤ کے لیے ورزش پر بھی توجہ دی جانی چاہیے ، ورزش قوت کے حصول کاذریعہ ہے ۔ حدیث صحیح میں ہے : ’’قوی مومن اللہ کے نزدیک بہتر اور پیارا ہوتا ہے مومن ضعیف کے مقابلے میں ‘‘۔ (احمد و مسلم)
گھر کے ہر فرد کا ورزش کامعمول ہونا چاہیے ۔ ورزش کی بہترین صورت چلنا ہے ، بچوں کو زیادہ کھیل کود کا موقع ملنا چاہیے ۔ حدیث میں آیا ہے : ’’اپنی اولادوں کو تیراکی، تیر اندازی اور گھڑ سواری سکھاؤ‘‘۔ گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہے وہ بچوں اور دیگر گھر والوں کو اس کی عادت ڈالے ۔ایسے کھیل کھیلنے کی تلقین کرے جن سے ان کے جسم کے ساتھ اخلاق بھی بہتر ہوں ۔
بعض لوگ صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد تلاوت و ذکر کرتے ہیں اور پھر واک کرتے ہیں جو بہت اچھی عادت ہے ۔ اس سے روح و جسم کو خوشی اورسرور ملتا ہے ۔ جس طرح ایک مسلمان کو کھانے پینے اور لباس اور دیگر امور میں اسراف سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے ۔ غیر ضروری فیشن پرستی پر خرچ کرنا مال کا ضیاع ہے یہ نفس کے لیے فساد کا باعث بنتا ہے ، لباس ضرورت کے مطابق خریدا جائے اسی طرح گھر کی اشیاء و سامان بھی ضرورت کے مطابق خریدنا چاہیے ۔ میانہ روی اور اعتدال معاشی مسائل سے نجات دلانے والا عمل ہے ، البتہ ضرورت کے مطابق خرچ کرنا اوربخل و کنجوسی کرنے میں فرق ہے ، مسلمان کو بخل اور کنجوسی سے منع کیا گیا ہے ۔
اس میں کوئی شک نہیں ہر دور کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں جو ممکن ہے ایک دوسرے سے مختلف ہوں بس فیصلہ اس کی اہمیت اور ضرورت کو مدنظر رکھ کر کیا جانا چاہیے ۔
[نوٹ یہ سلسلہ مضامین سعید حویٰ کی تصنیف ’’البیت المسلم‘‘کی تلخیص و ترجمہ پر مشتمل ہے -]

مبشر نذیر
ترکی کا سفرنامہ(21)

ہمارے دین دار افراد اگرچہ اخلاقیات کو اچھا سمجھتے ہیں مگر بالعموم اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ۔ ان کے ہاں مخصوص وضع قطع اور فرقہ وارانہ اختلافات کو جتنی اہمیت دی جاتی ہے اور اس پر جتنا زور صرف کیا جاتا ہے ، اس کا عشر عشیر بھی اخلاقی تربیت پر صرف نہیں کیا جاتا۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے مذہبی طبقے کے افراد میں بھی کرپشن عام ہے ۔ مدارس اور مساجد کے فنڈز سے لے کر حکومتی فنڈز میں خورد برد کے بہت سے کیسز سامنے آ چکے ہیں ۔اسی اخلاقی تربیت کے فقدان کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسجدکے منبر و محراب کو ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن کی دین میں کوئی اجازت نہیں ہے ۔
طوسیہ کے چاول
اب وادی کچھ وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ سڑ ک کے دونوں جانب ہرے بھرے کھیت نظر آ رہے تھے ۔ جہاں فصل پک چکی تھی وہاں کھیتوں کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ یہ طوسیہ کا علاقہ تھا جو چاول کے کھیتوں کے لئے مشہور تھا۔ سبز کھیتوں میں سبزے کے مختلف شیڈ موجود تھے ۔ کہیں رنگ زردی کے قریب تھا اور کہیں ہلکا سبز۔ کہیں یہ گہرا سبز تھا۔ دور زرد گھاس کے اندر ایک نیلی جھیل نظر آ رہی تھی۔ یہ سب اللہ تعالی کی قدرت کے مختلف رنگ تھے ۔وادی میں ایک تنگ سا دریا بہہ رہا تھا جو کہ ہماری اپر جہلم نہر جتنا چوڑ ا تھا۔
کچھ دور دریا ہمارے ساتھ چلا۔ مجھے اب کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ ترکی میں کافی کا استعمال بہت ہی کم ہے ۔ اس کے برعکس ان کی اپنی چائے زیادہ استعمال کی جاتی ہے ۔سعودی عرب میں ٹرکش کافی کے نام پر جو کافی پیش کی جاتی ہے ، اس کا ترکی میں کہیں رواج نہ تھا۔ ایک بڑ ا ریسٹ ایریا آیا۔ میں اتر کر ہوٹل میں گیا۔ خوش قسمتی سے یہاں کافی مل گئی۔ یہاں پر کافی کو نیسلے کے مشہور برانڈ کے نام پر "نیس کیفے " کہا جاتا ہے ۔کافی اتنی تیز تھی کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے گاڑ ی کی ریس پر پاؤں کے دباؤ میں اضافہ کر دیا مگر پھر بھی ہماری گاڑ ی بمشکل 120 کی رفتار پر جا رہی تھی۔
جستجو اور تحقیق
سڑ ک پر کچھ مغربی سیاح کندھوں پر بیگ لٹکائے اپنی سائیکلوں پر جا رہے تھے ۔ یہ غالباً "ٹور دی ورلڈ" قسم کے سیاح تھے ۔ بعض لوگ ایڈونچر پسند ہوتے ہیں اور کوئی عجیب سا کارنامہ کر کے ممتاز ہونے کے لئے اس قسم کے کام کرتے ہیں ۔ ان حضرات میں دراصل جستجو اور تحقیق کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے ۔ اگر اسی توانائی کو کسی مثبت اور تعمیری کام میں صرف کیا جائے تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے ۔ اللہ تعالی نے یہ مادہ انسان کے اندر اس لئے رکھا ہے کہ وہ خوب سے خوب ترکی تلاش کرے ۔ دنیاوی معاملات میں تو انسان ایسا ہی کرتا ہے ۔ اگر وہ بازار میں کوئی چیز لینے جاتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کم سے کم قیمت میں وہ بہترین سے بہترین چیز خریدے ۔ وہ دس دکانوں پر جاتا ہے ۔ ان کی مصنوعات اور ان کی قیمتوں کا جائزہ لیتا ہے ۔ ان کا باہمی تقابل کرتا ہے اور پھر جو سب سے بہتر لگے وہ خرید لیتا ہے ۔
یہی انسان دین کے معاملے میں انتہا درجے کی غیر ذمہ داری کا رویہ اختیار کرتا ہے ۔ وہ جس

مذہب، مسلک اور فرقے میں پیدا ہو جائے ، اس سے مضبوطی سے چمٹا رہتا ہے ۔ اس کے ذہن میں جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ کوئی دوسرا مذہب یا مسلک حق پر ہو اور میرا مذہب ہی غلط ہوتو وہ اس سوال کو سختی سے دبا دیتا ہے ۔ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں واضح طور پر فرما دیا ہے :
وَالَّذِينَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنّ ّهُمْ سُبُلَنَا۔ جنہوں نے ہماری راہ میں جستجو کی، ہم ضرور ضرور انہیں اپنی طرف راستہ دکھا دیں گے ۔ (عنکبوت 29:69)
یہ درست ہے کہ ہر شخص میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ تحقیق کر سکے مگر ذہن میں اٹھنے والے سوالات کو دبا دینا ہی وہ جرم ہے جس کا حساب ہمیں اللہ تعالی کے حضور دینا ہو گا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جب انسان کے ذہن میں اپنے مذہب، مسلک یا فرقے سے متعلق کوئی سوال پیدا ہو تو وہ اپنے فرقے کے اہل علم کے علاوہ دیگر فرقوں کے اہل علم سے بھی اس کا جواب پوچھے اور پھر اس کے سامنے جو راہ کھلے ، اس پر چلنے کی کوشش کرے ۔ افسوس کہ ہم دین کو اتنا بے وقعت سمجھتے ہیں کہ جو مذہب یا فرقہ ہمیں سب سے پہلے مل جائے ، ہم سوچے سمجھے بغیر اسے اختیار کر لیتے ہیں ۔
ہمارے ذہنوں میں یہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا جاتا ہے کہ ہم حق پر ہیں ، ہمارے سوا جو لوگ ہیں سب باطل پر ہیں ۔ ہمارا کوئی قصور نہیں ، ہر معاملے میں قصور صرف دوسروں کا ہے ۔ ہم سب سے بڑ ے ہیں ، دوسرے تمام لوگ ہمارے مقابلہ میں چھوٹے ہیں ۔ ہم خدا کے محبوب ہیں ، دنیا بھی صرف ہماری ہے اور آخرت بھی صرف ہماری ہی ہے ۔ کچھ ایسی ہی برین واشنگ دوسرے مذاہب اور فرقوں کے مذہبی راہنما اپنے پیروکاروں کے ذہنوں کی کر دیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مسلک اور فرقے میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو جاتے ہیں ۔
ہمارے ہاں بعض فرقہ پرست لوگ بھی فرقہ واریت کو برا کہتے ہیں ۔ ان کے خیال میں فرقہ واریت کا آسان سا حل یہ ہوتا ہے کہ دوسرا ان کے نقطہ نظر کو قبول کر لے ۔ حل تو بڑ ا سادہ ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ دوسرے کے ذہن میں بھی حل یہی ہوتا ہے ۔ فرقہ پرست ہونے کی بجائے انسان کو حق پرست ہونا چاہیے ۔ انسان کی کمٹ منٹ فرقے کی بجائے حق سے ہونی چاہیے ۔
اب ہم "بویا بت" نامی شہر کے پاس سے گزر رہے تھے ۔ ''گرزے '' کے مقام پر ''سامسن سائنپ یولو'' پر جا پہنچے ۔ اب ہم بلیک سی کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے ۔ یہ ڈبل روڈ تھی۔ یہاں اونچی نیچی ڈھلانوں پر کھیت بنے ہوئے تھے ۔ بعض کھیت تو کافی ترچھے تھے ۔ شام کے آٹھ بج رہے تھے اور سورج غروب ہو رہا تھا۔اب اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اب ترکوں کی ایک اور خوبی سامنے آئی۔ سب لوگوں نے گاڑ یوں کی لائٹیں مدہم رکھی ہوئی تھیں ۔ تیز لائٹوں سے سامنے والے ڈرائیور کو تکلیف ہوتی ہے جو کسی حادثے کا سبب بھی بن سکتی ہے ۔
یہی معاملہ ہارن کا ہے جو آواز کی آلودگی (Noise Pollution) پھیلاتے ہوئے دوسروں کو ایذا دینے کا باعث بنتا ہے ۔ اسی وجہ سے دنیا کی تمام مہذب اقوام تیز لائٹوں اور ہارن کے استعمال سے پرہیز کرتی ہیں ۔اب سڑ ک بہتر ہوتی جا رہی تھی اوراسی مناسبت سے رش بھی بڑ ھ رہا تھا کیونکہ سامسن شہر قریب آ رہا تھا۔ہم لوگ ''دریائے کی زی لرمارک'' یا سرخ دریا کو پار کرتے ہوئے شہر کی طرف جا رہے تھے ۔

تاریخ میں سامسن کی وجہ شہرت یہ ہے کہ 1919ء میں مصطفی کمال نے جنگ آزادی کا آغاز یہیں سے کیا تھا۔ اس سے متعلق کچھ آثار یہاں پر ملتے ہیں ۔ بہتر ہو گا کہ آگے بڑ ھنے سے پہلے مصطفی کمال اور ان کی تحریک کا جائزہ لے لیا جائے ۔یہ تفصیلات ان کی آفیشل ویب سائٹ www.ataturk.com سے لی گئی ہیں ۔

پروین سلطانہ حنا
غزل

یہ کاروبارِ ہست و بود ہے کیا
کبھی سوچا بھی ہے معبود ہے کیا
بظاہر تو نظر آتا نہیں ہے
ہمارے درمیاں موجود ہے کیا
جو خود ہے اپنے ہونے کی گواہی
وہی شاہد، وہی مشہود ہے کیا
سما جاتا ہے جو آنکھوں کے تلِ میں
وہ اپنے عکس میں محدود ہے کیا
ثنا گر جس کا ہے ہر ایک ذرہ
پسِ آئینہ وہ محمود ہے کیا
جسے سورج بھی سجدہ کر رہا ہے
میرا مالک وہی مسجود ہے کیا
لہو کی طرح مجھ میں دوڑ تا ہے
مجھے حاصل میرا مقصود ہے کیا
بڑ ی نا معتبر ہے یہ کہانی
زیاں کیا ہے یہاں پہ سود ہے کیا
بہت سے بے گناہ مارے گئے ہیں
ابھی زندہ کوئی نمرود ہے کیا

جنت کی عزت کا مستحق کون ہے

’’بے شک انسان بے صبرا پیداکیا گیا ہے ، جب اس پر مصیبت آتی ہے توگھبرا اٹھتا ہے اورجب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے توبخل کرنے لگتا ہے ۔
مگروہ لوگ(اس عیب سے بچے ہوئے ہیں)جونمازپڑ ھنے والے ہیں ، جواپنی نمازکی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں ۔

اورجن کے مالوں میں سائل اورمحروم کا ایک مقرر حق ہے ۔
اوروہ جوروزجزاکوبرحق مانتے ہیں ۔
اورجواپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کاعذاب ایسی چیزنہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو۔
اورجواپنی شرم گا ہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ بجزاپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پرکوئی ملامت نہیں ، البتہ جواس کے علاوہ کچھ اورچاہیں وہی حدسے تجاوزکرنے والے ہیں ۔
اورجواپنی امانتوں کی حفاظت اوراپنے عہدکاپاس کرتے ہیں ۔
اورجواپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں ۔
اورجواپنی نمازکی حفاظت کرتے ہیں یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے ۔‘‘
(معارج 19-35:70)